بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

ایک دفعہ پھر مسئلہ رجم پر بحث چھڑ گئی ہے۔
مختلف مدارسِ فکر کے ۲۶ اہلِ علم کا ایک متفقہ بیان ہمارے سامنے ہے۔ اس مختصر بیان کا اہم حصّہ درج ذیل ہے۔

"شادی شدہ زانی اور زانیہ کی سزائے رجم تمام مسلم ائمہ مجتہدین کے نزدیک حدود میں شامل ہے۔ احادیثِ متواترہ اور اجماعِ امت سے واضح طور پر اس کا ثبوت موجود ہے۔ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے بہ طور حد رجم کی سزا سنائی گئی ہے۔"

منصورہ لاہور سے میاں طفیل محمد صاحب نے اپنے بیان میں اسی بات کو ذرا زیادہ زور سے بیان کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

"ہم نہایت واشگاف الفاظ میں واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ عدالت کا یہ فیصلہ (یعنی سزائے رجم اسلامی حد نہیں ہے) شریعتِ اسلامی کے صریحاً خلاف ہے۔ کیونکہ شادی شدہ زانی و زانیہ کے لیے رجم کا حکم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قولی و فعلی سنّت سے نہایت قطعیت کے ساتھ ثابت ہے۔ اور اسلامی قوانین کا ماخذ جس طرح سے قرآن مجید ہے، اسی طرح سے سنّتِ رسولؐ بھی ہے۔ رجم تعزیری سزا بھی نہیں کہ جس کا نفاذ حکومت یا عدالت کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہو بلکہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں رجم کے لیے حد کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اس لیے جو شخص بھی رجم کو اسلامی احکام کے منافی کہتا ہے یا اس میں ترمیم تنسیخ کرنے یا ایسا مشورہ دینے کی جسارت کرتا ہے وہ سنّتِ رسولؐ کو مسترد کرنے کا

مرتکب ہوتا ہے۔ یہ بڑی الم انگیز بات ہے کہ جن لوگوں کو پاکستان میں اسلامی قوانین کی تنفیذ و تعمیل کی ذمہ داری سونپی گئی ہے وہی ایسے غلط فیصلے کرنے لگیں۔"

راقم نے جہاں تک اس مسئلے پر غور کیا ہے، ملت اسلامیہ کی پوری تاریخ میں، دور رسالت و سعادت اور خلافت راشدہ سے لے کر، بعد کے تمام ماہرین قانون و فقہ اور قاضیوں اور مفتیوں تک اگرچہ تسلسل سے رجم کی حد برقرار رہی ہے، اور یہ بات خود اس حد کے واجب القبول اور لازم النفاذ ہونے کی دلیل ہے، مگر ملت میں خوارج و معتزلہ کے دور سے لے کر آج تک جہاں کہیں فتنۂ انکار حدیث پایا گیا ہے، وہاں حد رجم کے خلاف دلیل بازی ہوتی رہی ہے۔ یہ دلیل بازی پچھلی چودہ صدیوں میں کتاب و سنت کو سرچشمۂ قانون ماننے والے کثیر التعداد عظیم علماء اور ان پر اعتماد کرنے والے عوام کی قوت کی وجہ سے نتیجہ خیز نہیں ہو سکی۔

ہمارے یہاں جب موجودہ معاشرے اور اس کی جدید تعلیم یافتہ قیادت اور خاص طور پر اس کی بیوروکریسی میں مغرب پرستی کا مرض بڑھا اور مغرب ہی ایک طبقے کے لیے اس حد تک معیار فیصلہ بن گیا کہ اسی معیار کے مطابق فیصلہ کیا جانا چاہیے کہ اسلام کیا ہے اور کیا نہیں ہے؟ شریعت کے احکام کیا ہونے چاہییں اور ان کی تعبیر و توضیح کس طرح کی جانی چاہیے؟ ہمارے جدید طبقوں نے جب کسی عقیدے یا حکم کے متعلق اپنے اندر بغاوت کا رجحان دیکھا یا جدید تہذیب کو اس پر چیں بہ جبیں پایا تو اس کے قائم شدہ علمی اور عملی تصور سے بچ نکلنے اور اس کے مفہوم کو مسخ کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ اگر احادیث نے تجدد کا راستہ روکا تو اولاً انہوں نے یہ کہا کہ یہ احادیث صریحاً عقل کے خلاف ہیں یا قرآن سے ٹکراتی ہیں، لہٰذا صحیح نہیں ہیں۔ پھر جب دیکھا کہ یہ مشکل تو تقریباً ہر مسئلے میں پیش آتی ہے تو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شارعانہ حیثیت کو ختم کیا، ان کے منصب تبیین و توضیح قرآن کو چھینا اور ان کو قرآنی حقائق کی عملی تفسیر پیش کرنے والے واجب الاتباع صاحب اسوہ ہونے کے مرتبہ سے محروم کیا (نعوذ باللہ) آخری تدبیر یہ نکالی کہ رسول خدا کی احادیث سے جو احکام ثابت ہیں وہ آپ نے بحیثیت امیر اپنے زمانے کے لیے دیے تھے، ہم سے کیا سروکار۔

پھر جب آیات سے اُن کی مسلّمہ عملی تفصیل الگ کر دی گئی تو اِس گروہ نے کہا کہ یہ خلاء جو پیدا ہو گیا ہے اسے علمی طور پر ہم پورا کریں گے اور سیاسی اور انتظامی طور پر یہ کام خدا و رسولؐ کے کرنے کا ہے اور خدا و رسولؐ کے معنی "مرکزِ ملت" ہیں اور "مرکزِ ملت" کا مطلب سربراہِ ریاست یا معاشرے کی قوتِ حاکمہ (SOVERIEGN POWER) ہے۔ پہلی بار ان معنوں میں "مرکزِ ملت" کا اطلاق سابق گورنر جنرل ملک غلام کی حکومت پر کیا گیا۔

آیئے ذرا اس طبقے کے طرزِ استدلال ملاحظہ فرمایئے:

"قرآن کریم میں زنا کی سزا رجم (سنگسار) کہیں نہیں آئی۔ نہ شادی شدہ کے لیے نہ غیر شادی شدہ کے لیے۔ سنگسار کی سزا بعد میں وضع کردہ ہے۔ (واقعاتی تاریخ میں سے اس زمانے کا تعین ہونا چاہیے تھا اور وضع کرنے والے اشخاص کا بھی۔ ف۔ ح) اور اُسے منسوب کیا جاتا ہے حضور رسالت مآب کی ذاتِ گرامی کی طرف۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہؐ (معاذ اللہ) قرآن کے احکام کے خلاف بھی فیصلے دیا کرتے تھے"۔

(قرآنی فیصلے، مطبوعہ ادارۂ طلوعِ اسلام کراچی۔ سال ۱۹۵۳ء۔ ص ۱۷۷)

جی ہاں! حضورؐ نے نماز اور زکوٰۃ کی جو تفصیلات دی ہیں، وہ سب بھی قرآن پر اضافہ ہیں۔ ایک ایسے حکم کو جس کے کسی بھی شکل میں ادا کر لینے کی آزادی حاصل تھی، اُسے متعین صورتوں کا پابند بنا کر (نعوذ باللہ) ان حضرات کے فلسفے کی رُو سے قرآن پر اضافہ کیا، بلکہ حقیقت میں مخالفت کی۔ اسی طرح سارق اور سارقہ خواہ ایک دمڑی کے معاملے میں مجرم ہوں، خواہ بنک سے توڑے اُٹھا لے جائیں، قرآن کی رُو سے اُن کے ہاتھ کاٹ دیے جاہییں۔ کوئی پابندی نہیں کہ ہاتھ کی تعریف کیا ہے، یعنی کہاں تک ہاتھ شمار ہوگا۔ (آیت وضو سامنے رہے) اور کیسے کاٹا جائے، ایک ٹوکے سے یا آرے سے، یا کدال کسی سے؟ ان باتوں کی وضاحت فرما کر حضورؐ نے کیا کتاب اللہ میں اضافہ کیا ہے یا اس کی مخالفت کی ہے؟

اصل قصہ یہ ہے کہ یہ حضرات رسولؐ کو شارع (مامور من اللہ) مانتے ہی نہیں کہ الفاظِ قرآن کے علاوہ رسولِ خداؐ کے کسی فرمان یا حکم کو ثابت ہونے پر اس شعور سے قبول کر لیں کہ یہ اُس خدا کی مفسّرِ قرآن

صاحبِ اسوۂ حسنہ اور مطاع باذن اللہ کا حکم ہے جسے اپنے دل کے مزعومات اور رواجی فلسفوں اور غالب تہذیب کے تقاضوں کو ٹھکرا کر تسلیم کرنا ہے۔ [۵]

اس وقت متعدد اطراف میں خاص خاص منکرینِ حدیث اپنے اپنے مورچوں میں بیٹھے ہیں اور سیکولر مزاج مغربی طبقے کو اپیل کرنے والے مباحث چھیڑ رہے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ اسلامی نظام کے پرچے کی وجہ سے خوف اور بیزاری کا جو غبار اُن کے دلوں پر چھایا ہوا ہے وہ چھٹ جائے۔ ہمارے علماء خوب سمجھ لیں کہ اس وقت اسلامی نظام کا راستہ روکنے کے لیے دنیا بھر کی مخالفِ اسلام قوتوں کی پشت پناہی چار محاذوں کو حاصل ہے۔ ایک ثقافتی محاذ، دوسرا دوش بدوش کا نعرہ لگانے والی مرعوبِ فرنگ خواتین کا محاذ (جنہیں موجودہ حکومت محض دوپٹہ سر پر رکھنے کے لیے بھی راضی نہیں کر سکی) تیسرا کمیونسٹ تخریب پسند سیاست بازوں کا محاذ اور چوتھا منکرینِ حدیث کا محاذ۔

اس چوتھے محاذ کے سامنے نقشہ یہ ہے کہ اوّل تو اسلامی قوانین کے نفاذ کی رفتار بڑی سست ہے اور مجموعی نظام کے بجائے متفرق احکام ایک ایک کر کے سامنے آ رہے ہیں، دوسری طرف جن شکلوں میں قوانین مدوّن ہو رہے ہیں اُن میں رخنے رہ جاتے ہیں، تیسرے جس عدالتی نظام اور پولیس کے ذریعے ان کا عملی نفاذ ہوتا ہے اس کی ایک سطح پر اسلامی قوانین کے لیے انقلابی انداز کی ذہنی تیاری موجود نہیں ہے اور دوسری سطح پر جو قانون چلتا ہے اُس کا عملاً حلیہ بگڑ جاتا ہے۔

ایسے حالات میں چاہیے کہ علماء مسئلہ رجم پر ایسی مدلل بحثیں سامنے لائیں کہ جن خاص خاص طریقوں سے ذہنی بے اطمینانی پیدا کی جا رہی ہے، اُن کا توڑ ہو جائے اور اہلِ علم میں بھی اور عوام میں بھی جو ٹیڑھے سوالات پیدا کیے جا رہے ہیں، اُن کا شافی جواب سامنے آ جائے۔ میرے خیال میں ذہنی ابتری کے دور میں یہ کافی نہیں ہے کہ اتنی بات زور سے کہہ دی جائے کہ شروع سے آج تک فکری طور پر بھی اُمت مسئلہ رجم

---

[۵] کاش کہ یہ گروہ رسول اللہ سے اتنا وفادار ہوتا کہ آپ کے احکام کو کم سے کم کسی مارشل لاء کے ڈکٹیٹر یا کسی جمہوری صدر یا وزیر اعظم یا پارلیمنٹ کے جاری کردہ احکام کی طرح واجب الاطاعت سمجھتا۔ حکومت کے قوانین و احکام اور دفتری ضابطوں کی تو من مانی تعبیرات کر کے انہیں کھیل بنانے کی جرأت نہیں، لے دے کے ساری عقل اور ساری آزادیٔ خیال کا استعمال حضورؐ کے ارشادات کے خلاف کیا جاتا ہے۔

پر منحصر رہی ہے اور عملی طور پر بھی اس کا نفاذ جاری رہا ہے۔

مثال کے طور پر ریٹائرڈ جسٹس یعقوب علی خاں کا ایک مضمون میرے سامنے ہے جو پاکستان ٹائمز (مؤرخہ ۲ مارچ ۱۹۸۱ء) میں چھپا ہے، اور یہ ایران کے حوالے سے اجرائے حدود کے متعلق ایک بحث پر مبنی ہے جو نیوز ویک مؤرخہ ۱۴ جولائی ۱۹۸۰ء میں شائع ہوئی تھی۔

جسٹس موصوف کے بحث و استدلال کو تو یہاں درج کرنا مشکل ہے۔ البتہ ان کے چند اہم نکات یا دعاوی درج ذیل ہیں۔

۱۔ اسلام سے پہلے سنگین، وحشیانہ اور ظالمانہ سزائیں رائج تھیں۔ مگر اسلام چونکہ انسانیت سکھانے آیا تھا لہٰذا اس نے دوسرے شعبوں کی طرح جرم و سزا میں بھی تبدیلیاں پیدا کیں۔ اسلام اور صاحبِ اسلام کی رحمۃ للعلمینی کے خلاف ہے کہ وہ مجرم کو پتھر مار مار کر ہلاک کرنے کی سزا دے۔ ایسی صورت میں کہا جاسکتا ہے کہ اسلام وحشیانہ اور ظالمانہ سزائیں دیتا ہے۔

۲۔ سورۂ نور کی آیت بسلسلہ سزائے زنا (آیت ۲) میں چونکہ زانی اور زانیہ کے الفاظ "ال" کے ساتھ آئے ہیں، لہٰذا آیت ہر قسم کے ارتکابِ زنا کو محیط ہے۔ زانی و زانیہ کے کنوارا یا نکاحی ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا یعنی سب کی سزا سو کوڑے رہے گی (کوئی اور شخص کہہ سکتا ہے کہ سو کوڑے مارنا وحشیانہ سزا ہے پھر کیا ہوگا۔ نظریہ رحمۃ للعلمینی تو کوڑوں سے بھی سخت مجروح ہوگا۔)

۳۔ رجم کے متعلق جتنی احادیث ہیں، احادیث میں حدِ رجم کے نفاذ کے جو واقعات اور صحابہ کرامؓ کے ارشادات مذکور ہیں، وہ سب سورۂ نور کی آیت نمبر ۲ کے نازل ہونے سے پہلے کے ہیں۔

۴۔ اگر حدِ رجم کے قرآن میں مذکور نہ ہوتے ہوئے اس کو دین یا قرآن کا تقاضا کہا جائے تو اس کے دوسرے معنی یہ ہوں گے کہ قرآن تمام امور میں اپنی جگہ مکمل نہیں ہے۔

۵۔ سورۂ نور کی مقرر کردہ حد کو حدیث سے تبدیل نہیں کیا جاسکتا۔

۶۔ قرآن میں ۹ مقامات پر زنا موضوعِ کلام ہے۔ کسی ایک جگہ بھی رجم کا ذکر نہیں۔

۷۔ خوارج اور معتزلہ کے مفسرین کے حوالے سے یہ دلیل بھی دی گئی ہے کہ سورہ نساء میں چونکہ یہ حکم

ہے کہ اگر کوئی کنیز زنا کا جرم کرے تو اسے آزاد عورت کے مقابلے میں آدھی سزا دی جائے اور رجم کی سزا کا آدھا کوئی معنی نہیں رکھتا، لہٰذا رجم شرعی حد نہیں ہے۔

میں یہاں ان نکات کا جواب نہیں دے رہا، بلکہ ان کو علماء کے سامنے رکھ رہا ہوں کہ یہ ہیں وہ فکری الجھنیں جو کچھ ذہنوں میں ہیں اور وہ انہیں دوسروں تک منتقل کرتے ہیں۔ صرف نکتہ نمبر ۷ ایسا ہے کہ چونکہ وہ بہت عام حلقوں میں بہ آسانی غلط فہمی پیدا کر سکتا ہے۔ لہٰذا میں خاص اس کا جواب تفہیم القرآن سے نقل کر رہا ہوں۔ یہ سورۂ نساء کی آیت نمبر ۲۵ پر حاشیہ نمبر ۴۶ ہے۔

"سرسری نگاہ میں یہاں ایک پیچیدگی واقع ہوئی ہے جس سے خوارج اور ان دوسرے لوگوں نے فائدہ اٹھایا ہے جو رجم کے منکر ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ——— اگر شادی شدہ عورت کے لئے شریعتِ اسلام میں زنا کی سزا رجم ہے تو اس کی نصف سزا کیا ہو سکتی ہے جو لونڈی کو دی جائے؟ لہٰذا یہ آیت اس بات پر دلیل قاطع ہے کہ اسلام میں رجم کی سزا ہے ہی نہیں ——— لیکن ان لوگوں نے قرآن کے الفاظ پر غور نہیں کیا۔ اس رکوع میں لفظ مُحْصَنٰتُ (محفوظ عورتیں) دو مختلف معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ ایک شادی شدہ عورتیں جن کو شوہر کی حفاظت حاصل ہو، دوسرے خاندانی عورتیں جن کو خاندان کی حفاظت حاصل ہو، اگرچہ وہ شادی شدہ نہ ہوں۔ آیت زیر بحث میں مُحصنات کا لفظ لونڈی کے بالمقابل خاندانی عورتوں کے لئے دوسرے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ نہ کہ پہلے معنی میں۔ جیسا کہ آیت کے مضمون سے صاف ظاہر ہے بخلاف اس کے لئے لونڈیوں کے لیے مُحصنات کا لفظ پہلے معنی میں استعمال ہوا ہے اور صاف الفاظ میں فرمایا کہ جب انہیں نکاح کی حفاظت حاصل ہو جائے (فَاِذَآ اُحْصِنَّ) تب ان کے لئے زنا کے ارتکاب پر وہ سزا ہے جو مذکور ہوئی۔ اب اگر غائر نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ خاندانی عورت کو دو حفاظتیں حاصل ہوتی ہیں۔ ایک خاندان کی حفاظت جس کی بنا پر وہ شادی کے بغیر بھی محصنہ ہوتی ہے۔ دوسری شوہر کی حفاظت جس کی وجہ سے

اس کے لیے خاندان کی حفاظت پر ایک اور حفاظت کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ بخلاف اس کے لونڈی جب تک لونڈی ہے محصنہ نہیں ہے۔ کیونکہ اس کو کسی خاندان کی حفاظت حاصل نہیں ہے۔ البتہ نکاح ہوتے پر اس کو صرف شوہر کی حفاظت حاصل ہوتی ہے اور وہ بھی اُدھوری۔ کیونکہ شوہر کی حفاظت میں آنے کے بعد بھی نہ تو وہ ان لوگوں کی بندگی سے آزاد ہوتی ہے جن کی ملک میں وہ تھی، اور نہ اُسے معاشرت میں وہ مرتبہ حاصل ہوتا ہے جو خاندانی عورت کو نصیب ہوا کرتا ہے۔ لہٰذا اُسے جو سزا دی جائے گی وہ غیر شادی شدہ خاندانی عورتوں کی سزا سے آدھی ہوگی، نہ کہ شادی شدہ خاندانی عورتوں کی سزا سے۔ نیز یہیں سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ سورۂ نور کی دوسری آیت میں زنا کی جس سزا کا ذکر ہے وہ صرف غیر شادی شدہ خاندانی عورتوں کے لیے ہے جن کے مقابلہ میں یہاں شادی شدہ لونڈی کی سزا نصف بیان کی گئی ہے۔ رہیں شادی شدہ خاندانی عورتیں تو وہ غیر شادی شدہ محصنات سے زیادہ سخت سزا کی مستحق ہیں کیونکہ وہ دوہری حفاظت کو توڑتی ہیں۔ اگرچہ قرآن اُن کے لیے سزائے رجم کی تصریح نہیں کرتا۔ لیکن نہایت لطیف طریقہ سے اُس کی طرف اشارہ کرتا ہے جو بلید الذہن لوگوں سے مخفی رہ جائے تو رہ جائے، نبی کے ذہنِ رسا سے مخفی نہیں رہ سکتا۔"

یہ عبارت درج کرتے ہوئے مجھے افسوس ہوا کہ جسٹس یعقوب علی جیسے حضرات بھی زیادہ گہرائی تک کاوش و مطالعہ نہیں کرتے۔

ایک اہم بحث جسٹس صاحب (اور دوسرے حضرات) کی تحریروں میں ان روایات کی بنیاد پر اُٹھائی گئی ہے کہ آیت رجم نازل ہوئی تھی مگر منسوخ التلاوۃ ہوگئی۔ اس مغالطہ انگیز جواب کی تردید میں اور متعلقہ روایات کی تاویل میں رسائل و مسائل (از مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مغفور، حصہ ۳ کی طویل بحث (از صفحہ ۱۴۱) سے کسی بھی سلیم الطبع آدمی کو بڑی مدد مل سکتی ہے۔ جسٹس صاحب بھی ملاحظہ فرمالیں۔

میری گذارشات کا مقصد یہ ہے کہ اہلِ تجدد کی پیدا کردہ ظلمتِ تشکک کا ازالہ کرنے کے لیے علماء کو مخالفانہ دلائل کا قلع قمع ذرا زیادہ تفصیل سے کرنا چاہیے تھا۔